ڈاکٹر جمیل جالبی

اکیسویں صدی اور عالم اسلام

جدھر جائیے' اخبارات اٹھائیے مضامین پڑھئے' گفتگو کیجئے' ہر طرف' ہر محفل' ہر مجلس میں اکیسویں صدی کا ذکر ضرور آتا ہے۔ ہر شخص یوں انتظار کر رہا ہے جیسے اکیسویں صدی من وسلویٰ کی صدی ہوگی' ہر طرف خوشیوں کا بازار گرم ہوگا اور ہر طرف امن و آشتی کا دور دورہ ہوگا اور وہ سب کچھ ہوگا جس کی اس ارض خاکی پر حیوان ناطق کو ضرورت ہوگی۔ اگر ایسا ہے تو میں بھی اس صدی میں مسرتوں سے لبالب بھری زندگی گزارنے کا خواہش مند ہوں گا۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ خیال آیا کہ کیوں نہ تاریخ انسانی کی ورق گردانی سے اکیسویں صدی کی فال نکالی جائے تاکہ آنے والی صدی کی ایک تصویر نظروں کے سامنے آجائے۔ معاً خیال آیا کہ اب سے تقریباً اکیس سال پہلے بھی جو چودھویں صدی ہجری ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوئی تھی اور پندرھویں صدی ہجری نے وقت کی دہلیز پر قدم رنجہ فرمایا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اہل پاکستان نے اس صدی کا بھی ایسے ہی انتظار کیا تھا' جس طرح اکیسویں صدی عیسوی کا کر رہے ہیں' لیکن ہوا یوں تھا کہ ایک دن مغرب کے وقت' جب دونوں وقت ملتے ہیں' پندرھویں صدی ہجری طلوع ہوگئی تھی اور پھر دو چار مہینے کے شور شرابے اور جذباتی عمل کے بعد یہ بھی وقت کی ریت پر اسی طرح جاسوئی تھیں جس طرح تیرھویں صدی عیسوی میں بغداد پر تاتاریوں کے حملے کے بعد ہماری صدیاں خواب غفلت کی چادر لے کر گہری نیند جاسوئی تھیں اگر یہ منظر ہماری نسل نے اکیس سال پہلے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا تو اب اکیسویں صدی کی آمد بھی ہمارے لئے ایسی ہی ہوگی۔ ممکن ہے ۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ء کی رات کو ہمارے نوجوان سڑکوں پر نکل آئیں اور پٹاخے چلا کر' پھلجھڑیاں چھوڑ کر اور رنگ برنگ کے گولے فضا میں داغ کر ذرا دیر کو زندگی کی جذباتی ورومانی رونقوں میں اضافہ کر دیں اور پھر وہی دن ہوں اور وہی راتیں جن سے ہم گزشتہ سات سو سال سے گزر رہے ہیں ؎

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے

اگر اکیسویں صدی کو یوں ہی آنا ہے جیسے ہر دن اور ہر رات آتے ہیں تو پھر اکیسویں صدی کا انتظار فی الحقیقت کیا معنی رکھتا ہے؟

مجھے تو کچھ یونہی معلوم ہوتا ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ زندگی کا ایک سیدھا سادا سا دائمی اصول ہے کہ آپ، جو آج بوتے ہیں کل وہی کاٹتے ہیں۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ آپ آج جو بوئیں اور کل گندم کاٹیں۔ آج ہم نے جو کچھ بویا ہے اور جو کچھ بوئیں گے وہی اکیسویں صدی میں کاٹیں گے۔ اپنے چاروں طرف نظر دوڑایئے تو آپ دیکھیں گے کہ ہم نفرتیں بو رہے ہیں' ناانصافیوں سے معاشرے کی جڑیں کاٹ رہے ہیں' ہر شخص ایک دوسرے کے حقوق سلب کر کے اپنا الّو سیدھا کر رہا ہے' جبر ہمارا مزاج ہے' استحصال اور ناانصافی ہمارا مسلک ہے' فرقہ پرستی اور قبائلی انداز نظر ہمارا اصول حیات ہے' اختلاف ہماری عادت ہے اور اسی لئے جہاں اختلاف نہیں ہے وہاں ہم اختلاف کا بیج بو کر نئے نئے فتنوں کو جنم دے رہے ہیں' اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد بنا کر نئے نئے فرقوں کو اس لئے جنم دے رہے ہیں تاکہ ہم وقتی طور پر سیاسی فائدہ اٹھا سکیں' اسلام کے نام پر مسلمانوں کا خون بہا رہے ہیں۔

یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہ سب کچھ ذرا ذرا سے ذاتی فائدوں کے لئے کور چشمی اور بے حیائی سے اس طرح کر رہے ہیں کہ ہمارا ضمیر بھی مر گیا ہے۔ جبر کی کھیتی میں نفرتوں کی کھاد اور افتراق واختلاف کے بیج ڈال کر ہم تیزی سے اکیسویں صدی کی طرف سفر کر رہے ہیں اور نادانی سے یہ سمجھ رہے ہیں کہ اکیسویں صدی ہمارے لئے گل و گلزار بن کر خوشیوں کی خوشبوئیں بکھیرنے والی صدی ہوگی۔

غور کیجئے کہ اوپر سے نیچے تک کتنے لوگ ہیں جو آج بامعنی و بامقصد زندگی گزارنے کا دعویٰ کر سکتے ہیں جسے دیکھئے رزق حلال و حرام سے بے نیاز ہو کر دولت بٹورنے کے عمل میں دن رات لگا ہوا ہے۔ زر پرستی ہماری زندگیوں میں اس طرح در آئی ہے کہ خدا سے پناہ مانگنے کی خواہش بھی باقی نہیں رہی۔ ہم بے عمل' بے مقصد اور بے معنی زندگی گزار کر اپنے معاشرے کے پانی کو اتنا گندہ و غلیظ کر چکے ہیں کہ اب اس میں سے نکلنے والی تیز بدبو ناک کے بال تک جلائے دے رہی ہے یہ جو کچھ ہو رہا ہے آپ بھی اسی طرح جانتے ہیں جس طرح میں جانتا یا محسوس کرتا ہوں لیکن ہم علاج سے گریزاں' عمل و تدبیر سے دور' بے عملی کی بیساکھیوں پر گھسٹ رہے ہیں اور بقول سرسید:

" ہماری قوم کی مثال اس شخص کی ہے جو طبیب سے نسخہ لکھوا لے اور دوا کا استعمال نہ کرے اور چاہے کہ صرف نسخہ لکھوا لینے سے بیمار کو شفا ہو جاوے"

موجودہ صورت حال میں مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم شاید اکیسویں صدی میں بھی اسی صورت سے زندگی بسر کر رہے ہوں گے۔ غور کیجئے کہ ہم نے اپنے عمل سے اپنی فکر سے' اپنی جدوجہد و تدبیر سے ابھی کون سی تیاریاں کی ہیں کہ اکیسویں صدی' ہماری زخموں سے نڈھال بیسویں صدی سے کچھ مختلف ہوگی۔ مجھے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت مغربی دنیا کے جو تیور ہیں' ہوائیں جس سمت چل

رہی ہیں' ان کے حساب سے اکیسویں صدی ہمارے لئے نئے مسائل و مصائب کی صدی ہوگی اور اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ پہلی دنیا کی ساری اقوام نے اپنی منزل مقرر کر کے اکیسویں صدی میں نہ صرف داخل ہونے کی تیاریاں کرلی ہیں بلکہ دس سال پہلے ہی اس صدی میں داخل ہو چکی ہیں۔

قومیں علم و آگہی سے بنتی اور ترقی کرتی ہیں۔ قومیں نفرتوں' بے معنی اختلافات اور فسادات سے نہیں بلکہ اتحاد' اتفاق اور تدابیر سے آگے بڑھتی ہیں۔ ہم اس سطح پر بھی دنیا کی بیشتر اقوام سے کمزور اور پیچھے ہیں۔ ہم "اقراء" کی تلاوت کرتے ہیں اور باآواز بلند کرتے ہیں' علم کے تعلق سے اللہ اور رسولؐ کے احکام کا بار بار اعادہ کرتے ہیں' لیکن حصول علم کے شوق و جذبہ سے عاری ہیں۔ اس صورت میں اکیسویں صدی' جو آٹھ سال بعد آنے والی ہے' وہ بھی ہمارے لئے یقیناً جہل و لاعلمی کی صدی ہوگی اور وہ اس لئے بھی کہ ہم نے جو کچھ آج بویا ہے وہی کل کاٹیں گے۔

میں سوچتا ہوں کہ ہم ہر دم اسلام اسلام کی تسبیح پڑھتے ہیں' لیکن اپنے عمل سے ہم نے اپنے باطن میں اسلام کو مسترد کر رکھا ہے ہم انفرادی و اجتماعی طور پر احکام قرآن کی جس طرح کھلم کھلا خلاف ورزی کر رہے ہیں وہ اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ ہم نے اسلام کا نسخہ تو لکھوالیا ہے لیکن نسخے میں لکھی ہوئی دوا استعمال کرنے سے گریز کر رہے ہیں۔ معاملات زندگی اور معاملات انسانی کے تعلق سے قرآن پاک میں جو ہدایات آئی ہیں آپ ان کی فہرست مرتب کر لیجئے اور اس فہرست کو اپنے اعمال سے ملا کر دیکھئے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی کہ ہم اسلام کے حوالے سے کہاں کھڑے ہیں؟ ہماری موجودہ روش سے تو یہی پتہ چلتا ہے کہ اکیسویں صدی میں بھی یہی صورت برقرار رہے گی۔

اکیسویں صدی کے تعلق سے ایک بات مجھے اور پریشان کر رہی ہے۔ ہم سب اسلام کا ہر وقت نام لیتے اور شور مچاتے ہیں' لیکن اس کی ہدایات پر عمل نہیں کرتے' ہمارے شور شرابے کی وجہ سے دشمن اسلام تو بیدار ہو گیا ہے لیکن ہم خود اس کی حکمت عملیوں سے غافل ہیں۔ اس وقت ساری مغربی دنیا اور امریکہ میں "بنیاد پرستی" کا لفظ کثرت سے بار بار استعمال ہو رہا ہے اور یہ عیسائی تصور' شور مچانے والے بے عمل اور غافل مسلمانوں کے لئے استعمال ہو رہا ہے۔ اکیسویں صدی میں یوں معلوم ہوتا ہے کہ ساری استعمار پسند' سرمایہ دار مغربی اقوام متحد ہو کر اسی طرح بنیاد پرستی پر حملہ آور ہوں گی جس طرح ان سب نے مل کر اشتراکیت پر ہلا بولا تھا۔ اب ان سے مقابلہ کرنے والا سوویت روس' میخائل گورباچوف کے ہاتھوں' ختم ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا ہے۔ اب انہیں اپنے حریف کے طور پر صرف مسلمان نظر آرہے ہیں جو شور مچا رہے ہیں لیکن آگے بڑھنے کی تدبیر سے غافل ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اکیسویں صدی کی پہلی دہائی اسی کام کے لئے وقف ہوگی جس میں بنیاد پرستی کو ختم کرنے اور محکوم بنانے پر عمل درآمد

ہوگا۔ایک طرف ہندوستان ہوگا اور دوسری طرف اسرائیل ہوگا جن کے سروں پر امریکہ اور اسکے اتحادیوں کا دستِ شفقت ہوگا اور بیچ میں اختلاف واحساس کمتری کی ماری' غیر متحد اور بے شعور و بے تدبیر مسلم دنیا ہوگی جسے بنیاد پرست کہہ کر محکوم بنانے کی تدبیریں کی جارہی ہوں گی۔

یہ تصویر یقیناً پریشان کن ہے' لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ خیالی دنیا میں مگن اور مست رہنے کے بجائے ہم اس صورت حال کو حقیقت پسندانہ نظر سے دیکھیں تاکہ اس سے وہ شعور پیدا ہو جس سے تدبیر کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔

اگر آپ بیسویں صدی پر نظر دوڑائیں تو یہ صدی اپنے زخموں سے چور اور لہولہان ہے۔اس وقت فکری سطح پر بیسویں صدی کے پاس کوئی نظام فکر موجود نہیں اور ساری اقوام عالم نئے نظام اور نئی فکر کی تلاش میں سرگرداں ہیں تاکہ اکیسویں صدی میں وہ اعتماد کے ساتھ داخل ہوسکیں۔انیسویں صدی نے اہل مغرب کو دو نظام فکر دیئے تھے :

ایک وہ نظام استعمال تھا جس پر چل کر مغرب نے ساری دنیا پر غلبہ حاصل کرلیا تھا اور اپنی سائنسی ترقی کی مدد سے ایک ایسا استعمال پسند سرمایہ دارانہ نظام قائم کیا تھا جس کا مزہ وہ بیسویں صدی میں خود بھی دو عالمگیر خونیں جنگوں اور ایک تیسری سرد جنگ کی صورت میں چکھ چکی ہے۔بیسویں صدی میں یہ منظر ہم نے خود دیکھا کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد یہ سب مغلوب و محکوم اقوام پھر آزاد ہونا شروع ہوئیں اور آج دنیا کی بیشتر اقوام آزاد ہو چکی ہیں۔

دوسرا مارکسی اشتراکی نظام تھا' جس نے بیسویں صدی کے انسان کو جنت ارضی کا خواب دکھایا تھا اور ایک عشرہ پہلے ہم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ یہ نظام اندر سے کھوکھلا ہو کر اس طرح بیٹھ گیا جس طرح زلزلے کے ایک شدید جھٹکے سے کوئی کمزور بنیاد اونچی عمارت زمین بوس ہو جاتی ہے۔اس وقت ساری دنیا ایک نئے نظام کی تلاش میں ہے۔ایک ایسا نظام عدل و مساوات جس سے دنیا میں امن وانصاف پر مبنی معاشرہ قائم ہوسکے اور حسن اتفاق سے اس وقت اسلام ہی وہ نظام فطرت ہے جو دنیا کے سارے مادی' فکری اور روحانی تقاضے پورا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اس طرح ہم اور ساری دنیا ایک نئے عہد کی دہلیز پر کھڑے ہیں۔

یہ صورت حال' جو آج موجود ہے' صدیوں میں کبھی کبھار پیدا ہوتی ہے' لیکن یہ کام صرف شور مچانے اور اسلام کا صرف ڈھول پیٹنے سے نہیں ہوسکتا بلکہ تدبیر و تفکر سے اسلام کو عالمی فکری طاقت بنانے سے ہوسکتا ہے۔اسلام کو عہد حاضر کی زبان اور اسلوب میں پیش کرنے کی ضرورت ہے تاکہ "بیسویں صدی کے تاتاریوں" کی روح کو مسخر کیا جاسکے یہ کام اختلاف کے فتنے جگانے' محض اپنی سیاسی

دوکان چمکانے کے لئے اپنے معاشرے کے باطن میں فرقہ پرستی کو ابھارنے، جہل اور غفلت سے نہیں ہو سکتا اس کیلئے ہمیں اپنے ذہن کے بند دریچوں کو کھولنا ہو گیا۔ ہمیں اس وقت امام غزالی اور شاہ ولی اللہ کی ضرورت ہے جو کھلے دل ودماغ سے عہد حاضر کے مسائل کو سمجھ کر اس کا حل تلاش کریں اور اسے ایک نظام کی صورت میں پیش کریں۔ سچے دین فطرت کی ترویج واشاعت کا ایسا اچھا موقع بیسویں صدی کے خاتمے پر آج صدیوں بعد آیا ہے۔ خدارا اسے ضائع مت کیجئے اسی علم سے اسی راستے سے آپ اکیسویں کو اپنی صدی بنا سکتے ہیں۔ پاکستان اسلام کے نام پر وجود میں آیا تھا۔ اس میں آگے دیکھنے، بڑھنے، اور سوچنے والے ایسے معاشرے کو جنم دینے کی ضرورت تھی جو ساری دنیا کیلئے مثال و نمونہ بن سکتا، لیکن ہم نے اس معاشرے کو ناانصافیوں کا گہوارہ، جبر واستحصال کا گڈولنا بنا کر بے ایمانیوں اور زر پرستی کا بازار بنا دیا ہے اس صورت میں اکیسویں صدی ہمیں اور اکیسویں صدی کو ہم کیا دے سکیں گے؟ یہ سوال ہماری لوحِ تقدیر پر جلی حرفوں میں لکھا ہوا لٹک رہا ہے۔

اکیسویں صدی کے تعلق سے ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں۔ کوئی دو سال کا عرصہ ہوا امریکہ کے ایک دانشور فرانسس فوکویاما کی ایک کتاب "The End of History and the Last Man" کے نام سے شائع ہوئی جس میں سوویت روس کے ٹوٹنے کے عمل کو سامنے رکھ کر یہ نتیجہ اخذ کیا گیا تھا کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا معاشرتی، معاشی و سیاسی نظام مارکسزم و سوشلزم کے آخری مرحلے پر پہنچ چکا ہے کیونکہ وہاں ایک ایسا غیر طبقاتی معاشرہ موجود ہے۔ جہاں ہر شخص اپنی پسند کی ہر چیز حاصل کر سکتا ہے اسی لئے فوکویاما صاحب فرماتے ہیں کہ

"آپ اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ امریکی معاشرے میں مالدار روسی اور چینی بستے ہیں اور روس و چین میں غریب امریکی آباد ہیں جو مالدار ہونے کی کوشش کر رہے ہیں"

وہ لکھتا ہے کہ اس اعتبار سے امریکی معاشرہ مارکسی نظام کے آخری مرحلے پر کھڑا ہے اور اسی لئے کہا جا سکتا ہے اور یہ اس کا نظریہ ہے کہ اب ان معنی میں تاریخ کا عمل ختم ہو گیا ہے اور اب آئندہ نظریاتی جنگوں کا کوئی امکان نہیں ہے آزاد جمہوریت یعنی لبرل ڈیمو کریسی کا نظام قائم ہو چکا ہے اور ساری دنیا اب اسی نظام کی طرف سفر کر رہی ہے۔ یہی انسانی نظام کی آخری منزل ہے وہ لکھتا ہے کہ اس نظام کی کامیابی کی دو وجوہ ہیں:

ایک یہ کہ اس معاشرے نے سائنسی ترقی سے نیچر کو مسخر کر لیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ جو معاشرے سائنس و ٹیکنالوجی کے اعتبار سے جتنے طاقتور ہوں گے وہ ان معاشروں پر غالب و حاوی رہیں گے جو سائنس و ٹیکنالوجی کے اعتبار سے کمزور ہیں۔ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ سائنس کے ذریعے

فطرت کو مسخر کرنے والے معاشرے بہتر انتظام کے حامل ہیں اور اس طرح سرمایہ دارانہ نظام نے اپنے تجارتی اداروں' منڈیوں اور سرمایہ دار صنعت کاروں اور تاجروں کے ذریعے اپنی اعلیٰ تنظیمی صلاحیتوں کا بہترین ثبوت فراہم کر دیا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ انسان کے اندر خود کو پہچانے جانے کا جذبہ کار فرما ہوتا ہے۔ آزاد جمہوریت ایک ایسا نظام ہے جس کے اندر رہ کر ہر شخص تدبیر و محنت سے اپنی اس خواہش کو پورا کر سکتا ہے اور یہ بات کہہ کر فوکویامایہ باور کراتا ہے کہ

"بس یہی وہ نظام ہے جسے اب دوام حاصل ہوگا"

غور کیجئے تو یہ بات پوری طرح صحیح نہیں ہے سرمایہ دارانہ نظام نے فلاحی مملکت اور معیار زندگی کے تعلق سے جو کچھ حاصل کیا اسے جبر و استحصال' استعماریت' نو آبادی نظام اور دنیا کی عظیم تہذیبوں کو تباہ و برباد اور ان کے وسائل پر قبضہ کر کے حاصل کیا ہے اور آئندہ بھی وہ یہی کرے گا۔ اس کی ایک جھلک ہم خلیج کی جنگ میں دیکھ چکے ہیں۔ ملت اسلامیہ کے مرکز بغداد کی تہذیب تیرھویں صدی عیسویں میں تاتاریوں کے ہاتھوں تباہ ہوئی تھی' جس کے باعث ہم سات سو سال سے آج تک پس ماندہ' کمزور اور بے اعتماد چلے آرہے ہیں اب "بیسویں صدی کے تاتاریوں" نے دوبارہ بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا کر نہ صرف سارے مشرق وسطیٰ کے وسائل پر قبضہ کر لیا ہے بلکہ اپنی گرفت کو مزید مضبوط کرنے کیلئے نئی نئی تدبیریں کی جارہی ہیں یہ ہے وہ لبرل ڈیموکریسی جسے فوکویاما انسانی نظام کا آخری مرحلہ کہتے ہیں' جس میں دور بربریت کا اصول " جسکی لاٹھی اسکی بھینس " کار فرما ہے اور اسی اصول کے پیش نظر امریکہ کے ایک اور دانشور جوزف نئی (Joseph Nye) کہہ رہے ہیں کہ

"امریکہ اور سارا مغرب بنیاد پرستی' کے خلاف نعرہ لگا کر صف آرا ہو رہا ہے"

مثنوی مولانا روم' تیرھویں صدی عیسوی میں بغداد کی تباہی کے بعد مسلم امہ جس صورت حال سے دوچار تھی' اس کو سامنے رکھ کر لکھی گئی تھی۔ اسی لئے اس میں ایسی حکایات کے ذریعے اعتماد بحال کرنے اور مایوسی کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس کی اس وقت مسلم امہ کو ضرورت تھی۔ مولانا روم نے ایک حکایت میں لکھا ہے کہ ایک جنگل میں ایک زبردست شیر رہتا تھا' جو ہر روز کئی جانوروں کو مار کر کھا جاتا تھا۔ سارے جانور پریشان تھے کہ کیا کریں۔ انہوں نے جنگل کے سارے جانوروں کا اجلاس بلایا اور غور و فکر کے بعد طے کیا کہ ہر وقت موت کے خوف میں مبتلا رہنے سے بہتر ہے کہ قرعہ کے ذریعے روز ایک جانور' جس کا نام نکلے' خود شیر کے پاس چلا جائے۔ اس پر سب نے اتفاق کیا۔ شیر کو اس بات کی اطلاع دے دی گئی۔ روز قرعہ پڑتا اور جس کا نام نکلتا وہ از خود شیر کے پاس چلا جاتا۔ ایک

دن ایک خرگوش کا نام نکلا اور وہ حسب دستور شیر کی طرف چل پڑا۔ یہ وہ خرگوش تھا جس نے اجلاس میں جب یہ فیصلہ سنا تھا تو اپنے دل میں کہا تھا کہ وہ ایسی تدبیر کرے گا جس سے شیر سے ہمیشہ کے لئے گلو خلاصی ہو جائے گی۔ اور جب اس کی باری آئی تو اس نے تدبیر سوچ لی تھی۔ خرگوش جان بوجھ کر دو گھنٹے کی تاخیر سے شیر کے پاس پہنچا۔ شیر بھوک کے مارے غصے میں غرا رہا تھا اس نے جو ننھے خرگوش کو اپنی طرف آتے دیکھا تو غصہ سے بھڑک اٹھا۔ خرگوش نے شیر کو اس حالت میں دیکھا تو عرض کیا :

"حضور ! مجھے تو صبح ہی بھیج دیا گیا تھا اور مجھے ہی نہیں بلکہ میرے ساتھ ایک اور خرگوش کو بھی بھیجا گیا تھا۔ ہمیں راستے میں آپ جیسا ایک اور شیر مل گیا اور ہم پر جھپٹ پڑا۔ میں مشکل سے بچ کر آپ تک پہنچا ہوں جب کہ میرے دوسرے ساتھی کو وہ مار کر کھا گیا"

شیر یہ سن کر غصہ میں آگیا، پوچھا "وہ شیر کہاں ہے ؟"

خرگوش نے کہا : "وہاں ہے"

اور اس راستے پر چل پڑا۔ آگے آگے خرگوش ، پیچھے پیچھے شیر ، چلتے چلتے وہ اسے ایک کنویں پر لے آیا اور کہا "حضور وہ اس کے اندر ہے"

شیر کنوئیں پر آیا اور جھانکا تو دیکھا کہ ایک ویسا ہی شیر کنوئیں کے اندر ہے۔ اسے دیکھ کر وہ غرایا تو دیکھا کہ کنوئیں کے اندر کا شیر بھی غرا رہا ہے اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ سے کنویں میں کود گیا۔ خرگوش نے حسنِ تدبیر سے اس طرح سارے جنگل کو شیر سے نجات دلوا دی۔

یہی وہ تدبیر ہے جس کی تیرھویں صدی میں مولانا روم نے تلقین کی تھی اور یہی وہ تدبیر ہے جس کی ہمیں ضرورت ہے۔ اسی تدبیر سے ہم "بیسویں صدی کے تاتاریوں" کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اسلام کا نام لے کر صرف شور مچانے سے ہم اپنا ہی نقصان کر رہے ہیں۔ تدبیر اور عمل سے 'اتحاد تفکر و تدبر سے ہم اکیسویں صدی کو اسلام کی صدی بنا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ بصورت دیگر اکیسویں صدی ہمارے لئے ایک ہولناک صدی ہو گی۔

گفتند جهان ما آیا بتومی سازد
گفتم که نمی سازد گفتند که برهم زن

کسی نے دوش دیکھا ہے نہ فردا
فقط امروز ہے تیرا زمانہ